مولانا حمید الدین فراہیؒ
کی
تفسیر سورہ لہب

مولانا ضیاء الدین اصلاحی

اسلامی علوم کی خدمت و اشاعت میں علماء ہند کے کارنامے اظہر من الشمس ہیں مگر اس سلسلہ میں اس حقیقت سے بھی صرف نظر نہیں کیا جا سکتا کہ معقولات سے بڑھے ہوئے شغف و انہماک نے ہندوستانی علماء کو منقولات اور علوم دینیہ کی جانب زیادہ متوجہ ہونے نہیں دیا اور جو توجہ کی گئی وہ شروح و حواشی کے دائرے تک محدود رہی، ہندوستان کیا پوری اسلامی دنیا میں ابتدائی صدیوں کے بعد علمی جدوجہد اور ذہنی اپج کا سلسلہ موقوف نظر آتا ہے۔ تفسیر اور قرآنی علوم کے میدان میں حالت اور زیادہ مایوس کن ہے اس تہی مائیگی اور تہی دامانی کا حال مولانا ابوالکلام آزاد کی زبان سے سننے کے لائق ہے، مولانا فرماتے ہیں:۔

"اسلام کی ابتدائی صدیوں سے لے کر قرون اخیرہ تک جس قدر مفسر پیدا ہوئے، ان کا طریق تفسیر ایک روبہ تنزل معیار فکر کی مسلسل زنجیر ہے، جس کی ہر پچھلی کڑی پہلی سے پست تر اور ہر سابق لاحق سے بلند تر واقع ہوئی ہے، اس سلسلے میں جس قدر اوپر کی طرف بڑھتے جاتے ہیں، حقیقت زیادہ واضح، زیادہ بلند اور اپنی قدرتی شکل میں نمایاں ہوتی جاتی ہے، جس قدر نیچے اترتے ہیں، حالت برعکس ہوتی جاتی ہے۔"[1]

آگے چل کر لکھتے ہیں:۔

"چوتھی صدی ہجری کے بعد علوم اسلامیہ کی تاریخ کا مجتہدانہ دور ختم ہو گیا اور شواذ و نوادر کے علاوہ عام شاہراہ تقلید کی شاہراہ ہو گئی، اس داء عضال نے جسم تفسیر میں بھی پوری طرح سرایت کی، ہر شخص جو تفسیر کے لیے قدم اٹھاتا کسی پیش رو کو اپنے سامنے رکھ لیتا تھا اور پھر آنکھیں بند

کرکے اس کے پیچھے پیچھے چلتا رہتا، اگر تیسری صدی میں کسی مفسر سے کوئی غلطی ہوگئی ہے تو ضروری ہے کہ نویں صدی کی تفسیروں تک وہ برابر نقل درنقل ہوتی چلی آئے، کسی نے ضرورت محسوس نہیں کی کہ چند لمحوں کے لیے تقلید سے الگ ہوکر تحقیق کرلے کہ معاملہ کی اصلیت کیا ہے، رفتہ رفتہ تفسیر نویسی کی ہمتیں اس قدر پست ہوگئیں کہ کسی متداول تفسیر پر حاشیہ چڑھادینے سے آگے نہ بڑھ سکیں، بیضاوی اور جلالین کے حاشیے دیکھو، ایک بنے ہوئے مکان کی لیپ پوت کرنے میں کس طرح قوت تصنیف رائگاں گئی ہے۔

زمانے کی بد ذوقی نے بھی ہر کج اندیشی کو سہارا دیا چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ قرون اخیرہ میں درس متداول کے لیے وہی تفسیریں مقبول ہوئیں جو قدما کے محاسن سے یک قلم خالی تھیں، وقت کا یہ سوئے انتخاب ہر علم و فن میں جاری رہا ہے، جو زمانہ جرجانی پر سکاکی کو اور سکاکی پر تفتازانی کو ترجیح دیتا تھا، یقیناً اس کے دربار سے بیضاوی و جلالین ہی کو حسن قبول کی سند مل سکتی تھی۔

متداول تفسیریں اٹھاکر دیکھو جس مقام کی تفسیر میں متعدد اقوال موجود ہوں گے، وہاں اکثر اسی قول کو ترجیح دیں گے جو سب سے زیادہ کمزور اور بے محل ہوگا، جو اقوال نقل کریں گے ان میں بہتر قول موجود ہوگا لیکن اسے نظر انداز کردیں گے"[۲]

مولانا آزاد کے خیال میں "ہر عہد کا مصنف اپنے عہد کی ذہنی آب و ہوا کی پیداوار ہوتا ہے" لیکن ان کے نزدیک "اس قاعدے سے صرف وہی دماغ مستثنیٰ ہوتے ہیں جنھیں مجتہدانہ ذوق و نظر کی قدرتی بخشائش نے صف عام سے الگ کردیا ہو"۔[۳]

انہی مستثنیات میں اس دور کے مشہور ہندی نژاد مفسر قرآن استاذ امام مولانا حمید الدین فراہیؒ بھی تھے، انھیں مجتہدانہ ذوق و نظر کی قدرتی بخشائش نے صف عام سے الگ کردیا تھا، ان کا خاص امتیاز یہ ہے کہ انھوں نے قرآن مجید کے فہم و تدبر کا ذوق پیدا کردیا اور اس کے مطالعہ و تحقیق کی ایک نئی راہ کھول دی، ان کا انداز فکر و نظر اپنے زمانہ سے جدا تھا، انھوں نے تفسیر اور قرآنیات کے ذخیرے میں جو امتیازی نمونے یادگار چھوڑے ہیں ان کی بناپر ان کی طرف سے یہ فخراً کہا جاسکتا ہے۔

وانی وان کنت الاخیر زمانہ لآت بما لم تستطعہ الاوائل

مدۃ العمر قرآن مجید ہی ان کے فکر و نظر اور غور و تامل کا مرکز و محور رہا اس کے نتیجہ میں اللہ تعالیٰ

نے ان پر اس کے حقائق و دقائق اور اسرار و رموز منکشف کر دیے تھے، ان کا ایک خاص مقصد علوم اسلامیہ کی تجدید و تطہیر تھا اور وہ قرآن مجید کی روشنی میں حدیث و فقہ، کلام و عقائد، فلسفہ و منطق، معانی و بلاغت اور صرف و نحو وغیرہ کو از سر نو مدون کرنا چاہتے تھے، ان کی تصنیفات میں جمہرۃ البلاغہؒ اور القائد الی عیون العقائدؒ ان کی اسی طرح کی کدو کاوش کا نتیجہ ہیں۔

مولانا فراہیؒ کو پورے قرآن مجید کی تفسیر لکھنے کا موقع نہیں ملا، تاہم اس موضوع پر انھوں نے جو کچھ ذخیرہ یادگار چھوڑا ہے وہ نہایت مفید اور بیش قیمت ہے ان کی ساری تصنیفات اور رسائل تفسیر قرآنی علوم و معارف کا گنجینہ، اسرار و دقائق کا خزانہ اور حقائق و نکات کا مجموعہ ہیں، ان میں مولانا کے تبحر و تعمق، تلاش و تحقیق، فکر و مطالعہ اور استنباط و استخراج نے نکتہ آفرینیوں اور دقیقہ سنجیوں کے انبار لگا دیے ہیں۔ ان کا کوئی رسالہ اور تصنیف حقائق و دقائق سے خالی نہیں ہے لیکن ایک مختصر مضمون میں ان سب کے جلوے دکھانا اور سب سے نمونے پیش کرنا ممکن نہیں ہے اس لیے ہم صرف ان کے ایک ہی تفسیری رسالہ تک اپنی بحث و گفتگو کو محدود رکھیں گے۔

مولانا حمید الدین فراہیؒ کے مجموعہ تفاسیر میں سورہ لہب کی تفسیر گوناں گوں اسرار و نکات سے معمور ہے اس میں متعدد ایسے مسائل و مباحث قلم بند کیے گئے ہیں جو مصنف کے اولیات میں شمار کیے جانے کے لائق ہیں ذیل میں ان کو نمبروار پیش کیا جاتا ہے۔

۱۔ سورۂ لہب کا ماقبل و مابعد کی سورتوں سے ربط و تعلق

اس سورہ کی تفسیر میں پہلی نمایاں خصوصیت جو دکھائی دیتی ہے وہ سورۂ نصر اور بعد کی سورتوں معوذتین اور اخلاص سے سورہ لہب کا ربط و تعلق ہے اس سلسلہ میں مولانا فراہی کی گہر فشانیاں قابل دید ہیں۔

مولانا کے نزدیک جس طرح اللہ تعالیٰ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت فتح مکہ پر تمام کی، اسی طرح آپ کے صحیفہ نبوت کو اس فتح عظیم کے ذکر پر ختم کیا، یہ گویا اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ حق اپنے مرکز پر پہنچ گیا، کعبہ کے مرکز توحید و اسلام ہونے کی وجہ سے فتح مکہ ہی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا مرکز تھی، اس کے بعد صرف ثبات و استقامت کی ضرورت تھی، اس کے لیے تین سورتیں اس کے بعد لگا دی گئیں، سورۂ اخلاص جو تمام معارف توحید

کا خزانہ ہے، یہ واضح کرنے کے لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کی غایت توحید ہے اور معوذتین دعائے استقامت کی تلقین کے لیے۔

اس تمہید سے مولانا یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ یہ تمام سورتیں نصر، اخلاص اور معوذتین باہمدگر نہایت مربوط ہیں، اس لیے ان کے درمیان سورۂ لہب کا رکھا جانا بھی کسی خاص سبب وحکمت پر مبنی ہے ورنہ پورا سلسلۂ نظم درہم برہم ہوجائے گا، چنانچہ وہ فرماتے ہیں کہ غور وفکر کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ سورۂ نصر میں جس فتح وغلبہ کا ذکر ہے، سورۂ لہب میں اسی کی توضیح وبشارت ہے گویا یوں فرمایا گیا کہ اللہ نے اپنے پیغمبر کو غلبہ دیا اور اس کے دشمن کو برباد کیا جیسا کہ ارشاد باری ہے۔

جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا (بنی اسرائیل ۸۱)	حق آگیا اور باطل مٹ گیا، بلاشبہ باطل مٹنے ہی کی چیز ہے۔

اس نظم کی ایک نہایت لطیف مثال مولانا فراہیؒ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اُس خطبہ میں بھی بتائی ہے جو آپ نے فتح مکہ کے روز باب کعبہ پر دیا تھا:۔

لا الٰہ الا اللہ وحدہٗ لا شریک لہٗ صدق وعدہٗ ونصر عبدہٗ وھزم الاحزاب وحدہٗ	خدائے واحد کے سوا کوئی معبود نہیں، اس کا کوئی شریک نہیں، اس نے اپنا وعدہ پورا کیا اور اپنے بندہ کی مدد کی اور یکہ وتنہا دشمنوں کی جماعتوں کو شکست دی۔

بظاہر تو یہ تین الگ الگ فقرے ہیں۔ مگر مولانا فرماتے ہیں کہ ایک صاحب نظر کو علی الترتیب ان میں تین سورتوں کے مضامین پنہاں دکھائی دیتے ہیں، پہلا فقرہ "لا الٰہ الا اللہ وحدہٗ" سورہ کافرون کا مضمون ہے، دوسرا جملہ "صدق وعدہٗ ونصر عبدہٗ" سورۂ نصر کے ہم معنی ہے اور تیسرا فقرہ "ھزم الاحزاب وحدہٗ" اور سورہ لہب ایک ہی حقیقت کی دو تعبیریں ہیں، پس جس طرح یہ تینوں فقرے ایک صاحب نظر کے لیے مربوط ومنظم ہیں، اسی طرح ان سورتوں کے مضامین بھی اس کو ایک ہی زنجیر کی بالکل مربوط کڑیوں کی شکل میں دکھائی دیں گی۔

۲۔ یہ سورہ بددعا اور ذم وشتم نہیں ہے

اس سورہ کی تفسیر میں مولانا کی عبقریت اور مجتہدانہ ذوق کا سب سے اہم نمونہ یہ ہے کہ وہ فرماتے

ہیں کہ" اس میں ابولہب یا اس کی بیوی کے لیے کوئی بد دعا نہیں کی گئی ہے بلکہ اس میں آئندہ کے ایک واقعہ کی خبر دی گئی ہے۔"

وہ مفسرین کے اس خیال سے متفق نہیں ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب کوہ صفا پر چڑھ کر اسلام کی عام منادی کی تو ابولہب نے آپ کو مخاطب کرکے کہا:۔

تبا لك ألهذا دعوتنا ہلاک ہو، کیا اسی کے لیے تو نے ہمیں بلایا تھا۔

اس کے جواب میں خدا نے ابولہب اور اس کی بیوی کی مذمت میں یہ سورہ اتاری تاکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ابولہب کی گستاخی سے جو رنج و ملال تھا وہ رفع ہو جائے، مولانا اس عام خیال کی نہایت مدلل تردید کرتے ہیں، ان کے نزدیک تبت یدا ہ کا مفہوم یہ ہے کہ وہ مقابلہ کرنے سے عاجز ہو گیا کیونکہ کسر ید (ہاتھ توڑ دینا) زور توڑ دینے اور عاجز کر دینے کی ایک تعبیر ہے، مولانا نے عربی اور عبرانی دونوں زبانوں سے اس کی مثالیں دے کر بتایا ہے کہ مکسور الید (شکستہ دست) سے مراد وہ شخص ہوتا ہے جو مقابلہ سے عاجز اور تلوار اٹھانے کی قدرت نہ رکھتا ہو، پس یہ آیت (تبت یدا ابی لہب) نہ تو بد دعا ہے اور نہ اس میں کوئی پہلو شتم کا ہے، بلکہ ابولہب کا ذکر کنیت کے ساتھ کیا گیا ہے جس میں ایک گونہ عزت و احترام کا پہلو نکلتا ہے۔ اس لیے ان کے نزدیک اس آیت کی تاویل یہ ہے کہ اس میں دشمنان خدا کے سرغنہ اور فرعون قریش کی ہلاکت کی بشارت ہے اور بعد کی آیت (ما اغنی عنہ مالہ وما کسب) میں ایک پیشین گوئی ہے۔

مولانا نے اس خیال کی تائید میں متعدد دلائل پیش کیے ہیں جن کو ہم نقل کرتے ہیں ان سے فہم قرآن مجید میں ان کی مہارت اور مجتہدانہ ذوق کا اندازہ ہوگا۔

ا۔ گو ابولہب نے آپ کی شان اقدس میں نہایت گستاخانہ الفاظ استعمال کیے لیکن قرآن مجید جاہلوں سے درگزر کرنے اور عمدہ اور شائستہ لب و لہجہ میں خطاب کرنے کی تعلیم دیتا ہے، اس مضمون کی متعدد آیتیں مولانا نے نقل فرمائی ہیں جن کو طوالت کے خوف سے قلم انداز کیا جاتا ہے، ان سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا کے بندگانِ خاص کا یہ وصف اور خصوصیت رہی ہے کہ جب جاہل ان سے الجھتے ہیں تو وہ ان کے لیے سلامتی کی دعا کرتے ہیں، پھر مولانا حضرت ابراہیمؑ اور ان کے باپ کے مکالمہ کا حوالہ دیتے ہیں کہ ان کے باپ نے انھیں سنگسار کرنے کی دھمکی دی مگر حضرت ابراہیمؑ نے جواب دیا کہ آپ پر سلامتی ہو، میں آپ کے لیے خداوند سے مغفرت کی

دعا کروں گا، اس کے بعد مولانا فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت ابراہیمؑ کے نقش قدم پر چلنے کا حکم ہوا تھا، آپ ان کے تمام فضائل وخصائص کے وارث تھے نیز آپ کو منکرینِ حق کی دلآزاریوں اور بدزبانیوں پر صبر کی تعلیم دی گئی تھی۔

وَاصْبِرْ عَلٰی مَا یَقُوْلُوْنَ وَاهْجُرْهُمْ هَجْرًا جَمِیْلًا (مزمل - ۱۸) ان کی باتوں پر صبر کرو اور ان کو خوبصورتی سے چھوڑ دو۔

۲۔ اگر ابولہب کی مذمت کر کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا غصہ وملال دور کرنا ہی منشائے الٰہی ہوتا تو آپ کو کفار کا مثلہ کرنے سے روکا نہ جاتا جبکہ انھوں نے آپ کے جاں نثار رضاعی بھائی اور محبوب چچا حضرت حمزہؓ کے جسم کا مثلہ کر کے آپ کو انتہائی صدمہ پہنچایا تھا۔

۳۔ اگر آپ اپنے دل کی بھڑاس نکالنا چاہتے تو فتح مکہ کے روز آپ کے جاں نثاروں کی بے پناہ تلواروں سے اہل مکہ کو کون بچا سکتا تھا لیکن آپ نے امن عام کی منادی کرا دی اور کسی کی ادنیٰ ایذارسانی بھی گوارا نہ فرمائی، آپ نے ان سے جہاد ضرور کیا، لیکن اس کا مقصد قیام عدل اور خدا کی زمین کو شر وفساد کے جراثیم سے پاک کرنا تھا، آپ کی پوری زندگی سے ذاتی انتقام کی کوئی مثال پیش نہیں کی جا سکتی، آپ نے ہمیشہ سختی کا جواب نرمی اور بدسلوکی کا لطف ومحبت سے دیا، یہ آپ کے خلق عظیم کا سب سے زیادہ نمایاں پہلو ہے۔

۴۔ اگر کسی خاص شخص کی مذمت ہی کی جاتی تو اس کے سب سے زیادہ مستحق ابوجہل اور رئیس المنافقین عبداللہ بن ابی تھے۔

۵۔ قرآن مجید نے کفار کی مذمت ہمیشہ بطریق کنایہ کی ہے، وہ مطلقاً صفات ذمیمہ کی مذمت کرتا ہے، تعیین وتشخیص اس کا اسلوب کلام نہیں۔

۶۔ اسی اصول پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی ہمیشہ بطریق تعریض مذمت فرماتے تھے مثلاً مابال قوم یفعلون کذا (ان لوگوں کو کیا ہو گیا ہے جو ایسا ایسا کرتے ہیں)۔

۷۔ کتب سابقہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعریف یہ آئی ہے کہ "وہ سخت کلام نہ ہوگا" آپ کے اور حضرت عیسیٰؑ کے درمیان یہی فرق ہے کیونکہ حضرت مسیحؑ کے کلام میں سبّ وشتم کی مثالیں بہت ہیں جیسے اے سانپ کے بچو! یا اے شیطان وغیرہ گو ممکن ہے کہ یہ نصاریٰ کی تحریف ہو۔

۸۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نہایت باحیا اور پاکیزہ کلام تھے، آپ کے اخلاق اور آپ کی شان کا تقاضا یہ ہے کہ آپ کی زبان سے جو کچھ نکلے وہ پاکیزگی اور لطافت کا نمونہ ہو۔

۹۔ لسان الٰہی نے نام لے کر اس کی بھی مذمت نہیں کی جو تمام کفار کا سرخیل، عزت و شرف میں ممتاز، قبائل کا سردار اور جماعتوں کا لیڈر تھا جس کی قیادت میں فوجیں صف آرا ہوتی تھیں اور جس کی آتش بیانی لوگوں کے اندر طوفان برپا کر دیتی تھی، پھر وہ ایک ارذل خلائق کے ذم و شتم سے آلودہ ہونا کیونکر گوارا کرتی۔

۱۰۔ سب سے اہم پہلو یہ ہے کہ مفسرین کی تاویل سورہ کے محل و مقام کے لحاظ سے بالکل نامناسب اور بے ربط ہے، ماقبل سورہ میں فتح مکہ اور استغفار و تسبیح کا ذکر ہے اور مابعد سورہ میں توحید کامل کا اعلان کیا گیا ہے، ان دو عظیم الشان مسئلوں کے بیچ میں گالی کا کیا موقع تھا؟

مولانا فراہیؒ کے نزدیک ابولہب کی طرح اس سورہ میں اس کی بیوی کی بھی کوئی مذمت نہیں کی گئی ہے اور نہ اسے بد دعا دی گئی ہے، وہ فرماتے ہیں کہ کسی خاص عورت کو اس بنا پر کہ اس نے پیغمبر عالم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے کسی صحابی کو ایذا دی ہے، گالی دینے اور مذمت کرنے کی کوئی وجہ نہیں، اگر قرآن مجید اس بات پر اتر آتا حالانکہ وہ اس سے پاک ہے تو اس کی گالی اور مذمت کی سب سے زیادہ مستحق وہ یہودیہ تھی جس نے آپ کے کھانے میں زہر ملا دیا تھا، جن اشقیا نے نہایت بے دردی کے ساتھ آپ کو طائف سے نکالا آپ نے ان کی بھی بجز اپنے خداوند کے کسی سے شکایت نہیں کی اور یہ شکایت بھی جن الفاظ میں فرمائی ان کی شیرینی اور لطافت کا کون اندازہ کر سکتا ہے؟ ابوجہل اور اس کے ساتھیوں کا شب و روز کا مشغلہ ذات رسالت کی توہین تھا اس لیے وہ سب سے زیادہ ذم و شتم کے مستحق تھے، لیکن شیریں کلامی اللہ اور اس کے رسول کو ہر چیز سے زیادہ محبوب ہے، اب غور کیجئے کہ جب قرآن نے ان مردوں میں سے کسی کو گالی نہیں دی تو ان کی عورتوں میں سے کسی کو گالی دینے کا بھلا کب روادار ہو سکتا ہے۔

آگے مولانا ان اسباب کو بیان کرتے ہیں جن کی وجہ سے لوگوں کو سورہ کی تاویل میں یہ غلط فہمی ہوئی اور انھوں نے اس کو ذم و شتم یا بد دعا کے معنی میں لے لیا ہے، گویہ اسباب مولانا کے نزدیک ضعیف ہیں، مولانا فرماتے ہیں کہ:۔

۱۔ غلط فہمی کی پہلی اور خاص وجہ یہ ہوئی کہ ابولہب نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب

کر کے تبالك کہا تھا، اس لیے اللہ تعالیٰ نے بھی اس کو ویسا ہی جواب دیا، اس سبب کے ناقابل اعتبار ہونے کی تفصیل پہلے ہی گزر چکی ہے۔

۲۔ دوسرا سبب یہ ہوا کہ ماضی کا صیغہ یا تو خبر کے لیے آتا ہے یا انشاء کے لیے، یہ سورہ ابولہب کی ہلاکت سے پہلے نازل ہوئی ہے، اس لئے یہاں صیغہ ماضی بمعنی انشا اس مقام پر لعنت کے لیے ہے جیسے کہا جاتا ہے تربت یداہ (اس کے ہاتھ خاک آلودہ ہوں) شلت یمینہ (اس کے ہاتھ شل ہو جائیں) مولانا اس کا جواب یہ دیتے ہیں کہ ماضی کا صیغہ اصلاً خبر کے لیے آتا ہے اور بعض اوقات ایسے واقعات کی خبر دی جاتی ہے جو واقع ہونے والے ہوتے ہیں، یہ ایک طرح کی پیشین گوئی ہوتی ہے، صحف سماوی اور قرآن مجید کی پیشین گوئیوں کے اسلوب سے جو لوگ آشنا ہیں ان کو اس میں شبہ نہیں ہو سکتا کہ (تبت یدا ابی لہب وتب ٥ ما اغنیٰ عنہ مالہ وما کسب) ایک واقع ہونے والے امر کا اعلان ہے، قرآن مجید میں ہے :۔

اَتٰٓى اَمْرُ اللّٰهِ فَلَا تَسْتَعْجِلُوْهُ (نحل:۱) اللہ تعالیٰ کا حکم آگیا، پس اس کی جلدی نہ کرو

یوحنا کے مکاشفات میں ہے "عظیم الشان بابل ڈہ گیا" حالانکہ یہ قول بابل ڈہنے سے پہلے کا ہے۔ بعد کی آیت (سیصلی ناراً ذات لہب) کا خبر ہونا قطعی ہے، اس لیے اس کا اقتضا بھی یہی ہے کہ پہلی آیت خبر ہو۔

۳۔ تیسری مقبول عام وجہ یہ ہے کہ لوگوں نے تبت یداہ کو تربت یداہ کے مفہوم میں لیا، مولانا فرماتے ہیں کہ یہ بات ان کے دعویٰ کو ثابت کرنے کے لیے کافی نہیں ہے، کیونکہ دعا کے لیے مخصوص صیغے ہوتے ہیں اور تباب سے دعا کے لیے صرف تباً کا لفظ مستعمل ہے، لیکن اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ اس کے دوسرے مشتق بھی دعا میں مستعمل ہیں، جب بھی وہی تاویل صحیح ہوگی جو سیاق وسباق سے زیادہ مناسب ہو۔

۴۔ چوتھی وجہ یہ ہے کہ حمالۃ الحطب منصوب لازم ہے مگر مولانا کے نزدیک منصوب ہونے کی علت ذم کو قرار دینا نہایت کمزور تاویل ہے، صحیح وجہ یہ ہے کہ حال ہے، مولانا نے آگے چل کر اس پر طویل بحث کی ہے جس کی قدر وقیمت کو عربی زبان کا صحیح ذوق رکھنے والے ہی محسوس کر سکتے ہیں اس لیے ہم اس کو قلم انداز کرتے ہیں۔

مولانا فراہیؒ نے یہاں تک از روئے تاویل یہ ثابت کیا ہے کہ یہ سورہ بد دعا نہیں ہے اور اس کی شروع کی دونوں آیتیں خبر یا پیشین گوئی ہے، اس کے بعد مولانا تاریخ کی روشنی میں اسے ایسی پیشین گوئی ثابت کرتے ہیں جو حرف بحرف پوری ہوئی یہ بحث بھی بڑے اہم حقائق و مطالب پر مشتمل ہے اس لیے اس سے تعرض کیے بغیر آگے بڑھنے کو جی نہیں چاہتا۔

مولانا فرماتے ہیں کہ غزوہ بدر تاریخ اسلام کا سب سے زیادہ عظیم الشان معرکہ ہے، خدا نے اسے "یوم الفرقان" کہا ہے اور اس نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم سے فتح و نصرت اور دشمنوں کو ہلاک کرنے کا جو وعدہ فرمایا تھا وہ اسی دن پورا کیا، آپ نے اسی دن دعا فرمائی تھی کہ "خداوندا تو نے مجھ سے جو وعدہ فرمایا ہے، اسے پورا کر" آپ کی دعا مسموع ہوئی اور اللہ نے آپ کو قریش کے تمام سرداروں کی قتل گاہیں دکھائیں اور آپ نے صحابہ کرام کو ایک ایک کی قتل گاہ دکھائی۔

اس لڑائی میں قریش کے جوش و خروش کا عجیب عالم تھا، انھوں نے پوری قوت میدانِ جنگ میں ڈال دی، ان کا بچہ بچہ جنگ کے نشہ میں سرشار تھا، حضرت عباس کو ایک حد تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت تھی، تاہم جوش عام کا سیلاب ان کو بھی میدان جنگ میں کھینچ لایا۔ لیکن ابولہب اس تاریخی معرکہ میں شریک نہ ہوا، عاص بن ہشام پر اس کے چار ہزار درہم قرض ہوتے تھے، وہ تنگدستی کی وجہ سے قرض ادا کرنے کے قابل نہ تھا، ابولہب کو روپئے ڈوب جانے کا اندیشہ تھا۔ اس نے عاص کی جان اس کے عوض خرید لی اور اپنا قائم مقام بنا کر بدر کے میدان میں بھیجا، اس طرح اس نے مال و دولت کو ناموس اور جان کے لیے ڈھال بنایا لیکن ائمہ کفر کی ہلاکت کا خدا نے فیصلہ کر لیا تھا، ابولہب معرکہ بدر کے ساتویں دن چیچک میں مبتلا ہوا اور ہلاک ہو گیا، اس کے دونوں بیٹوں نے چھوت کے خوف سے دو تین دن تک لاش گھر ہی پر پڑی رہنے دی، یہاں تک کہ سارا جسم سڑ گیا، ایک شخص کے غیرت دلانے پر ان کو دفن کا خیال ہوا تو دور ہی سے جسم پر پانی ڈالا پھر مکہ کے بالائی حصے میں لے گئے اور ایک دیوار کے پاس رکھ کر دور ہی سے پتھر پھینک کر لاش ڈھانک دی۔ پتھر مارنا لعنت ہے، مولانا نے سورۂ فیل کی تفسیر میں اس پر مفصل بحث کی ہے۔

واقعہ بدر کی ان تفصیلات کو پیش کر کے مولانا ہم کو غور و فکر کی دعوت دیتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ لسان غیب نے جو پیشین گوئی کی تھی وہ کس طرح حرف بحرف پوری ہوئی اسے نمبر وار ملاحظہ کریں۔

١۔ ابولہب مقابلہ کرنے سے عاجز رہا، اس نے اپنی تلوار نہیں اٹھائی اور میدان جنگ میں آنے سے گریز کیا۔

٢۔ اس کے اکثر اعوان قتل ہوئے، عرب اعوان و انصار کو ید کہتے ہیں، آنحضرت صلعم نے فرمایا وھم ید علی من سواھم۔

٣۔ ابولہب کا مال کام نہ آیا اس نے ایک شخص کو میدان جنگ میں جانے کے لیے خریدا تاکہ اپنی جان بچالے، لیکن وہ اپنے کو موت سے نہ بچا سکا۔

٤۔ قوت و شوکت کی بربادی کے ساتھ وہ خود بھی ہلاک ہوگیا۔

ماکسب سے حضرت عبداللہ بن عباس کے نزدیک اس کے بیٹے مراد ہیں، تاریخ سے ثابت ہے کہ اس کے بیٹے اس کے کام نہ آئے، اس کی آخری مصیبت میں انھوں نے اس کو چھوڑ دیا دوسرا قول یہ ہے کہ ماکسب سے اس کی وہ کمائی مراد ہے جو اس نے حرام و حلال ہر راہ سے جمع کی تھی۔

دونوں صورتوں میں مفہوم یہ ہوا کہ جس چیز نے اس کو بخل و خیانت پر آمادہ کیا وہ چیز اس کے کام نہ آئی، آدمی کے دین و تقویٰ کے لیے سب سے بڑا فتنہ مال و دولت اور اہل و عیال ہیں جیسا کہ بعض آیتوں میں تصریح موجود ہے، جمع مال میں مردوں کا غیر معتدل انہماک زیادہ تر عورتوں کی آرائش پسندی اور فرمائشوں کی تعمیل کے لیے ہوتا ہے جس کا نتیجہ دونوں کی بربادی ہے، مال اور اہل و عیال کے عشق نے ابولہب کو حرص و خیانت پر آمادہ کیا، لیکن خدا کی گرفت کے وقت یہ کچھ کام نہ آئے۔

مولانا فراہی نے تاویل کے جس پہلو کی جانب اشارہ کیا ہے اس سے بعد کی آیت سے پہلی دونوں آیتوں کا تعلق بالکل واضح ہوگیا ہے چنانچہ فرماتے ہیں کہ "خدا کا فیصلہ ہے کہ جو لوگ بیت اللہ کی حرمت کو برباد کریں گے وہ ہلاک ہوں گے اس نے خائن اور غدار لوگوں کا اقتدار بیت اللہ پر کبھی قائم نہیں رہنے دیا، اس طرح گویا ان کے نزدیک ابتدائی دو آیتوں میں خدا نے اس خائن کی ہلاکت کی خبر دی ہے اور تیسری آیت میں اس کے اس انجام کی خبر دی ہے جس سے وہ اس عذاب دنیوی کے بعد دوچار ہوگا یعنی :۔

سَيَصْلٰى نَارًا ذَاتَ لَهَبٍ (لہب:٣) وہ جلد بھڑکتی آگ میں پڑے گا۔

۳۔ آخرت میں عمل کے مناسب جزا

مولانا نے ایک اور اہم نکتہ کی جانب توجہ دلائی ہے اور اسے قرآن مجید کا ایک خاص اصول بھی بتایا ہے، وہ اس سورہ کی تیسری آیت سے ثابت کرتے ہیں کہ انسان آخرت میں اپنے عمل کے مناسب جزا پائے گا بلکہ خود اس کا عمل ہی اس کی جزا ہوگا، وہ فرماتے ہیں کہ ابولہب کے حالات اور اس کی اس جزا میں جس کا خدا نے ذکر کیا ہے، نہایت واضح مناسبت ہے۔

پہلے ابولہب کے حالات پر غور کرنے کی مولانا دعوت دیتے ہیں کہ وہ نہایت تند مزاج اور شعلہ رو تھا اسی وجہ سے اس کی کنیت اس قدر مشہور ہوئی کہ اس کا اصل نام عبدالعزی بالکل غائب ہوگیا، اس نے اپنے مشتعل اور مغرور نفس کی اصلاح کرنے کے بجائے اپنی حرص وطمع اور حسد وعداوت کی آگ اور زیادہ بھڑکا دی، اس کے بعد مولانا اس قاعدہ کا ذکر کرتے ہیں جو قرآن مجید میں مذکور ہے یعنی وہ عموماً ثواب وعقاب کو ایسی صورت میں بیان کرتا ہے جس کو اعمال سے خاص مناسبت ہوتی ہے اس سے صاف ظاہر ہے کہ آخرت میں انسان اپنے عمل کے مطابق ہی جزا وسزا پائے گا، جو اس نے یہاں بویا ہے وہاں وہی کاٹے گا، آج جو درخت لگایا ہے کل اسی کا پھل کھائے گا۔

اِنَّمَا تُجْزَوْنَ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ   تم جو کرتے تھے وہی بدلہ پا رہے ہو۔

(طور۔۱۶)

دوسری جگہ فرمایا:

ذُوْقُوْا مَا كُنْتُمْ تَكْسِبُوْنَ (زمر:۲۴)   جو تم نے کمایا ہے اسے چکھو!

اس سے بعض اہم حقائق کی طرف اشارہ مقصود ہوتا ہے، جو لوگ اس حیثیت سے قرآن مجید پر غور کریں گے ان پر یہ حقیقت روشن ہوگی کہ شہوات اور ان کے اثر کو آگ سے بہت زیادہ مشابہت ہے، اس سے ہم میں یہ یقین پیدا ہوتا ہوتا ہے کہ جزا درحقیقت عمل کا حاصل اور اس کا ثمرہ ہے، اس سے عدل الٰہی کے کمال پر ایمان پختہ ہوتا ہے، اسمائے الٰہی میں الحق، المبین اور خیر الحاکمین کی معرفت بڑھتی ہے اور یہ یقین محکم ہوجاتا ہے کہ خدا ذرہ برابر بھی ظلم نہیں کرتا۔

اس آیت میں جزا اور عمل کی مشابہت کے پہلو سے غور کرنے پر ابولہب کے اعمال اور اس کے حالات سے اس کی جزا کی مطابقت بالکل واضح ہوجائے گی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سَيَصْلٰى

نَارًا ذَاتَ لَهَبٍ ایک ایسے واقعہ کی خبر ہے جو حرف بحرف پورا ہوگا اور جس سے کسی حال میں مفر نہیں۔

قیامت کے روز ابولہب کی بیوی کا جو حال اس سورہ میں بیان کیا گیا ہے، اس سے بھی مولانا نے جزا و عمل میں مطابقت دکھائی ہے، ان کی اس تشریح سے اسے حمالۃ الحطب کہے جانے کی حکمت و معنویت بھی واضح ہو جاتی ہے، فرماتے ہیں۔

قرآن مجید میں ہے کہ مغرور امرا اور متکبر دولت مندوں کے لیے ذلت و اہانت کا عذاب ہوگا، کیونکہ یہی چیز ان کے لیے، زیادہ درد انگیز اور دردناک ہوگی، عربی میں مثل ہے النار ولا العار (آگ میں جل جانا گوارا ہے مگر ذلت گوارا نہیں) خدا نے ان کو خبر دی کہ تمہارے لیے آگ اور ذلت دونوں کا عذاب ہوگا۔

فَالْيَوْمَ تُجْزَوْنَ عَذَابَ الْهُوْنِ	آج تم کو ذلت کا عذاب دیا جائے گا کیونکہ تم
بِمَا كُنْتُمْ تَسْتَكْبِرُوْنَ فِي الْأَرْضِ	زمین میں ناحق تکبر کرتے تھے اور خدا کے حکموں
بِغَيْرِ الْحَقِّ وَبِمَا كُنْتُمْ تَفْسُقُوْنَ (احقاف:۲۰)	سے سرتابی کرتے تھے۔

دوسری جگہ فرمایا:۔

سَنَسِمُهٗ عَلَى الْخُرْطُوْمِ (قلم:۱۶)	ہم عنقریب اس کے نتھنے پر داغیں گے۔

ایک اور جگہ فرمایا

ذُقْ إِنَّكَ أَنْتَ الْعَزِيْزُ الْكَرِيْمُ	(خدا کا عذاب) چکھو، تم (دنیا میں) غالب
(دخان:۴۹)	اور باعزت تھے۔

اسی طرح عموماً جزا کو عمل کے مناسب بیان کیا گیا ہے تاکہ جزا کا عدل ہونا بالکل واضح ہو جائے۔

زر پرستی اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی عداوت کے جوش نے ابولہب کو بالکل مشتعل آگ بنا دیا تھا اور اس کی بیوی ہی نے زینت و آرائش اور زیوروں کے شوق میں اس کو ان جرائم پر آمادہ کیا، اس لیے اللہ تعالیٰ نے اس کو بھی شریک عذاب قرار دیا اور اس کی حالت حمالۃ الحطب کے لفظ سے بیان کی جس میں جزا اور عمل کی مشابہت کے بہت سے پہلو ہیں۔

۱۔ اس کو دنیا میں جو عزت اور شان حاصل تھی، آخرت میں اس سے محروم ہو کر وہ ذلت و خواری میں مبتلا ہوگی۔

۲۔ وہ جن قیمتی زیوروں پر فخر کرتی تھی وہ خود اس کے جلانے کے لیے ایندھن بن جائیں گے۔ ان دنیوی زخارف کی حقیقت ایندھن سے بہت مشابہ ہے گویا قیامت کے دن اس کی حالت اس شخص کی ہوگی جو اپنی سولی کا تختہ اور اپنے جلانے کے لیے ایندھن خود اپنے سر پر اٹھائے ہو، یہی حقیقت اس آیت میں مذکور ہے۔

يَحْمِلُوْنَ أَوْزَارَهُمْ عَلٰى ظُهُوْرِهِمْ	وہ اپنے بوجھ اپنی پیٹھوں پر لادے ہوں گے
أَلَا سَاءَ مَا يَزِرُوْنَ (انعام: ۳۱)	اور آگاہ! یہ برا بوجھ ہوگا۔

۳۔ اسی نے ابولہب کی خباثت نفس کی دبی ہوئی چنگاریوں کو بھڑکایا اس لیے گویا وہی اس کی آگ کے لیے ایندھن فراہم کرنے والی بنی، پس دنیا میں اس کے اس عمل کا تقاضا یہ ہے کہ وہ قیامت کے دن ایندھن ڈھونے والی لونڈی کی صورت میں اٹھائی جائے۔

۴۔ ابولہب کی سزا اس کی حالت کے بالکل مناسب بیان کی گئی ہے، یہی مناسبت اس کی بیوی کی سزا میں بھی ملحوظ ہے۔

۵۔ صرف حمالۃ الحطب کہنے پر اکتفا نہیں کیا بلکہ پانچویں آیت میں ایندھن ڈھونے والی لونڈی کی تصویر کھینچ دی اور کہا کہ فی جیدھا حبل من مسد یعنی اس کی گردن میں بٹی ہوئی مضبوط رسی پڑی ہوگی، اس اضافہ سے مولانا کے نکتہ رس ذہن اور مجتہدانہ ذوق نے مندرجہ ذیل حقائق مستنبط کیے ہیں۔

۱۔ اس میں ابولہب کی بیوی کی اس حالت کی توضیح ہے جو لفظ حمالۃ الحطب میں بیان ہوئی ہے۔

۲۔ یہ اس ذلت کی تصویر ہے جس میں بالآخر وہ قیامت کے دن گرفتار ہوگی۔

۳۔ عمل اور نتائج عمل کی موافقت کی طرف بھی اشارہ ہے کیونکہ جس ہار کو پہن کر وہ دنیا میں اتراتی تھی وہ قیامت کے دن موٹی رسی کی شکل میں بدل جائے گا۔ جس کی وجہ سے اس کی مثال اس لونڈی کی ہو جائے گی جو گلے میں رسی ڈال کر لکڑیاں چننے جا رہی ہو۔

۴۔ مغرور عورتیں محض آرائش پر قناعت نہیں کرتی ہیں بلکہ سامان آرائش کے حجم اور وزن کا بھی خاص خیال رکھتی ہیں اس مناسبت سے ضروری ہوا کہ رسی موٹی ہو۔

۴ سورہ کا زمانہ نزول

مولانا فراہیؒ نے اس سورہ کے زمانہ نزول کی جو وضاحت کی ہے اس سے بھی ان کی امتیازی

خصوصیت کا پتہ چلتا ہے، وہ لکھتے ہیں کہ صحابہ کرام سے اس کے زمانہ نزول کے بارہ میں کوئی روایت مذکور نہیں ہے، علما نے قرائن اور سورہ کے سیاق وسباق سے یہ استنباط کیا ہے کہ یہ مکہ میں اتری کیونکہ ابولہب غزوہ بدر کے بعد مرا، اس وجہ سے یہ قطعی ہے کہ سورہ اس کی موت سے پہلے اتری مگر جو لوگ اس سورہ کو ابولہب کی سخت کلامی کا جواب مانتے ہیں وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ یہ اوائل بعثت میں اتری۔

مولانا فراہیؒ اس خیال سے متفق نہیں ہیں، ان کے نزدیک یہ سرے سے غلط ہے کہ یہ سورہ ابولہب کی سخت کلامی کا جواب ہے بلکہ وہ یہ کہتے ہیں کہ اس میں ایک ہونے والے واقعہ کی پیشین گوئی اور خبر دی گئی ہے اس لیے لازماً یہ سورہ اس وقت اتری جب ابولہب کا کفر پر اصرار بالکل واضح ہو گیا تھا اور نبیؐ اتمام حجت کا فرض ادا کر چکے تھے اور اب خدا کے قانون کے مطابق ضروری ہو گیا تھا کہ آپ اس سے اعراض فرمائیں، مولانا نے قرآن مجید سے اس مفہوم کی آیتیں نقل کر کے دکھایا ہے کہ جن لوگوں کے افعال واقوال سے اس امر کی شہادت مل گئی کہ وہ کفر پر مصر اور آخرت سے بیزار ہیں، اللہ تعالیٰ نبیؐ کو ان سے اعراض کا حکم دیتا ہے یعنی جب خدا نے خبر دے دی کہ وہ راہ ہدایت اختیار کرنے والے نہیں تو ان کی ہدایت کی توقع نہیں کرنی چاہیئے خدا نے ہر چیز کے لیے ایک قانون بنا دیا ہے اور ہر معاملہ کی ایک حد ٹھہرادی ہے جب کفار پر حجت تمام ہو چکی اور ان کے توبہ کی مدت ختم ہو چکی تو اب ان کے معاملہ میں نرمی نہیں کرے گا اور وہ تم کو بھی حکم دیتا ہے کہ اس مدت کے ختم ہونے اور لوگوں کی ضد اور ہٹ دھرمی واضح ہو جانے کے بعد ان کو دعوت دینے اور ان کے ساتھ وقت ضائع کرنے سے رک جاؤ، مولانا حضرت ابراہیمؑ کی اپنے باپ سے برات اختیار کر لینے کی آیتیں نقل کر کے یہ بتاتے ہیں کہ جب ان کو یقین ہو گیا کہ ان کے باپ پر ایمان کا دروازہ ہمیشہ کے لیے بند ہو چکا ہے تو وہ ان سے بری ہو گئے۔

مولانا کے بتلانے ہوئے اس قرآنی اصول کو سامنے رکھ کر اگر ان کفار کے معاملہ میں غور کیا جائے جن پر خدا نے دنیا میں عذاب نازل کیا اور ان کو ہلاک کر دیا تو کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ ان کے توبہ کا امکان باقی تھا اس وجہ سے یہ عذاب ان پر ظلم ہوا، وہ اس حقیقت کی مزید وضاحت کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:۔

انسان جب جان بوجھ کر ٹھنڈے دل سے برائیوں کا مرتکب ہوتا ہے تو ان کا ضرر نہایت خطرناک ہو جاتا ہے، وہ انسان کا ہر طرف سے اس طرح احاطہ کر لیتی ہیں کہ اس پر ہدایت کا دروازہ

ہی بالکل بند ہو جاتا ہے اور اس کو گمراہی کی تاریکیوں سے نکلنا ہی نصیب نہیں ہوتا کیونکہ خدا نے اعمال اور ان کے نتائج کا جو قانون تمام کائنات میں جاری کیا ہے اس کی زنجیریں اس کو جکڑ لیتی ہیں، اس سے ثابت ہوا کہ خدا اپنی طرف سے کسی کو گمراہ نہیں کرتا بلکہ انسان خود ہی گمراہی کے اسباب فراہم کرتا ہے۔ قرآن مجید نے بہت سے مقامات پر اس حقیقت کو بیان کیا ہے کہ برے اعمال کے نتائج گمراہی، کج دلی، قساوتِ قلب اور دشمنی کی شکل میں ظاہر ہوتے ہیں، غرض اتمام حجت کے بعد دین کی دعوت سے وہ لوگ محروم کر دیے جاتے ہیں جو اپنے کفر و نفاق پر جمے رہنا چاہتے ہیں، اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں سے پیغمبرؐ کو اعراض کرنے کا حکم دیتا ہے، فرمایا:۔

فَذَرْهُمْ يَخُوضُوا وَيَلْعَبُوا حَتّٰى	پس ان کو چھوڑ دو کج بحثیاں کریں اور کھیل
يُلٰقُوا يَوْمَهُمُ الَّذِي يُوعَدُونَ	لیں یہاں تک کہ اس دن سے دوچار ہوں
(معارج: ۴۲)	جس کی ان کو دھمکی دی جارہی ہے۔

اس سے دو باتیں معلوم ہوئیں،

۱۔ اس سورہ میں ابولہب کی ہلاکت کی جو خبر دی گئی ہے یہ اس وقت سے متعلق ہے جب پیغمبرؐ اسلام نے مایوس ہو کر اس سے اعراض کر لیا تھا۔

۲۔ یہ سورہ ابولہب کو ایمان کی دعوت نہیں دے رہی ہے بلکہ مسلمانوں کو ان کے شدید ترین دشمن کی ہلاکت کی خوشخبری سنا رہی ہے۔

اس طرح مولانا فراہیؒ کے نزدیک یہ سورہ ہجرتؐ سے کچھ پہلے مکہ میں یا ہجرت کے بعد مدینہ میں اتری۔

۵۔ ابولہب کی خصوصیت ذکر کے اسباب

اس سورہ میں ابولہب کا خصوصیت سے کیوں ذکر ہے، مولانا نے اس کے کئی اسباب بیان کیے ہیں جن سے قرآن مجید میں ان کی گہری بصیرت اور وسعت نظر کا اندازہ ہوتا ہے۔

۱۔ ابولہب خانہ کعبہ کا کلید بردار اور متولی تھا اور اس نے اس دینی ریاست سے سخت ناجائز فائدے حاصل کیے، منصب افادہ کی بدولت اپنے گھر میں مال و دولت کا ایک بڑا خزانہ

جمع کرلیا، اس طرح ایک طرف اس کی شرک پرستی نے خانہ کعبہ کے ایک رکن اعظم توحید کو ڈھا دیا، دوسری طرف اس کی زر پرستی اور طمع مال نے اس کے دوسرے ستون پر بھی تیشے لگائے جو قربانی کا اصل مدعا تھا یعنی مساکین کی ہمدردی اور مہمانان خدا زائرین بیت اللہ کی خدمت، اس لیے خدا کا غضب جوش میں آیا اور بیت اللہ کی تولیت اس کے ہاتھوں سے چھین لی گئی۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم داعی حق تھے، آپ کو سب سے پہلے ان قرابتداروں کو عذاب الٰہی سے ڈرانے کا حکم ہوا تھا جو خانہ کعبہ کے متولی اور کلید بردار تھے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ کی بعثت کا سب سے بڑا مقصد کعبہ کا استخلاص اور اس کو کفر و شرک کی آلودگیوں سے پاک کرنا تھا اس لیے آپ نے امانت الٰہی کے اس خائن اور دین ابراہیمی کے محزب کو جو اہمیت دی وہ قریش کے تمام ارباب منصب وجاہ میں سے کسی کو نہ دی حالانکہ انھوں نے آپ کو ایذائیں دیں، آپ سے جنگیں کیں اور آپ کو بیت اللہ کے جوار سے نکالا، اس کی وجہ یہی ہے کہ اپنے دینی منصب کی وجہ سے دین الٰہی کا اصلی دشمن یہی تھا، باقی تمام قریش اس کے تابع فرمان تھے، پس جب یہ کہا گیا کہ ابولہب کے ہاتھ ٹوٹ گئے اور وہ خود ڈھ گیا تو گویا یہ اعلان کر دیا گیا کہ بنیاد کفر ہل گئی اور قلعۂ شرک و فساد مسمار ہو گیا، نصرت الٰہی کی بشارت کے بعد جس کا سورۂ نصر میں ذکر ہے یہ پیشین گوئی مسلمانوں کے لیے دوسری بشارت تھی۔

۲۔ خدا نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حسن خلق کا پیکر اور مکارم اخلاق کا معلم بنا کر بھیجا تھا، تمام مکارم کا شیرازہ تین چیزیں ہیں۔ فیاضی، صلہ رحمی اور اعانت ضعفاء، عرب ہمیشہ سے ان کے خوگر تھے اسی لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جب توحید اور ہمدردی کی دعوت دی تو شرفائے عرب کی جماعت دعوت کے دوسرے جز ہمدردی بنی نوع انسان سے ذرا بھی نہ کھٹکی، البتہ حمایت شرک کے جوش اور انکار معاد نے دعوت کے پہلے جز سے بیزار کیا اور وہ مخالفت پر کمربستہ ہو گئی، لیکن ابولہب کا حال اس کے برعکس تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت میں اس کی تمام سرگرمیاں حمایت شرک سے زیادہ اس کی زر پرستی اور حسد کا نتیجہ تھیں، یہ بات اس کی سیرت سے بالکل واضح ہے، جب قریش نے حمایت شرک اور حمیت جاہلیت کے جوش سے بے قابو ہو کر پورے خاندان بنو ہاشم کے خلاف مشہور ظالمانہ معاہدہ لکھا اور ان کے مشرک و مومن سب سے مقاطعہ کر لیا تو ابولہب نے تمام تعلقات قرابت سے

بے پروا ہو کر قریش کا ساتھ دیا حالانکہ عربوں کے نزدیک قطع رحم سے بڑھ کر کوئی گناہ نہ تھا، وہ اس کی قسم دلا کر باہم دگر مدد خواہ اور طالب اعانت ہوتے تھے اور اسے ہر چیز سے بالا سمجھتے تھے۔

ابولہب نے اس نازک وقت میں بنی ہاشم سے قطع تعلق کر کے اپنے لیے سب سے بڑی ذلت پسند کرلی، اگر اس کے خون میں عربی حمیت اور شرافت نفس کی ایک بوند بھی ہوتی تو وہ ابوطالب کے نقش قدم پر چلتا جو اپنے آبائی دین سے وابستہ ہو کر بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر قربان ہوتے رہے یا حضرت حمزہؓ کی تقلید کرتا جن پر اس جوش غیرت نے قبول اسلام کا دروازہ کھول دیا کہ ابوجہل نے ان کے بھتیجے کے ساتھ بدسلوکی ہے۔

قریش کے لیے سب سے بڑی مذہبی جنگ بدر کا معرکہ تھی جس میں اس کے تمام سردار حمایت مذہب کے نشہ سے سرشار تھے لیکن ابولہب گھر میں دبک کر بیٹھ رہا، اگر اس میں دینی غیرت کی کوئی چنگاری ہوتی تو اس موقع پر ضرور مشتعل ہوتی اور قریش کے سرداروں کی طرح وہ بھی میدان جنگ میں اترتا۔

ابوجہل اور ابوسفیان دونوں قریش کے سردار اور عرب جاہلیت کے سرخیل تھے، ان کی ہر بات میں غیرت وحمیت کا جوش ہوتا تھا مگر ابولہب کا عناد قومی عصبیت اور مذہبی حمیت کی روح سے بالکل خالی تھا، بنی ہاشم سے کنارہ کش ہو کر اس نے جس بے غیرتی کا ثبوت دیا اس کے لیے کوئی عذر تلاش نہیں کیا جاسکتا، صرف یہی کہا جاسکتا ہے کہ وہ رفادہ کا مال خرد برد کرتا تھا اور اس پر قابض رہنے کے لیے قریش کا ساتھ دینا ناگزیر تھا۔

ابولہب کی دنائت اور زر پرستی عالم آشکارا تھی، عرب کے سب سے زیادہ معزز، باوقار اور فیاض خاندان سے ہونے کے باوجود کعبہ سے سونے کے ہرن کی چوری کا الزام اسی پر لگایا گیا، ان باتوں سے ثابت ہوتا ہے کہ اس میں نہ ابوجہل کی دینی وقومی غیرت تھی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت اس جوش کا نتیجہ ہو، نہ اس کو ابوسفیان کی طرح سرداری حاصل تھی کہ اس کے لیے حریفانہ کاوش پیدا ہو بلکہ اس کا تمام بغض وعناد آپؐ کی اس تعلیم کی وجہ سے تھا کہ آپ فیاضی کا حکم دیتے تھے، بخل کی مذمت کرتے تھے، یتامیٰ اور مساکین کی اعانت کی تلقین فرماتے تھے، غلام آزاد کرنے کا اجر و ثواب بیان فرماتے تھے اور قحط ومصیبت کے ایام میں بنی ہاشم کی طرف سے غربا و مساکین کو کھانا کھلانے کی جو مقدس سنت حضرت ابراہیمؑ کی یادگار تھی اس کو قائم وجاری رکھنے

کی نصیحت فرماتے تھے، یہ تمام تعلیم تزکیہ نفس اور بیت اللہ کی ولایت کے منصب عظیم کے لیے ضروری تھی، لیکن ابولہب کے لیے اس کا ایک ایک نقطہ برق خرمن سوز تھا کیونکہ ان سے اس کے بخل وخیانت کا تمام اندوختہ معرض خطر میں تھا، پس وہ صرف مشرک ہی نہ تھا بلکہ خیر وکرم کے تمام اخلاق حسنہ کا دشمن بھی تھا اور صرف دنیا کی زندگی پر قانع اور مطمئن تھا، ان وجوہ سے یہ شخص، اسلام اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دشمنوں کا سرغنہ اور خیر وصلاح کے مخالفین کا سرخیل تھا۔

۳۔ مولانا فراہی نے ابولہب کی خصوصیت ذکر کی ایک وجہ اسلام کی مخالفت میں اس کی پیش قدمیوں کو بتایا ہے، ابتدا میں جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی دعوت شروع کی تو کسی طرف سے کوئی صدائے مخالفت بلند نہیں ہوئی کیونکہ آپ کی پچھلی زندگی جو امانت وتقویٰ کی بے مثال سیرت تھی، سب کی نگاہوں میں تھی لیکن ابولہب نے سبقت کی اور بول اٹھا "غارت ہو تو، کیا اسی کے لیے بلایا تھا" اس طرح وہ دعوت اسلام کی راہ میں ایک بھاری چٹان کی طرح جم گیا اور اپنی فتنہ انگیزیوں سے پرشوق دلوں کو بیزار اور راغب طبیعتوں کو متنفر کر دیا۔

دوسرے موقع پر آپ ؐ نے تمام قرابتداروں کو بلایا اور ان کے لیے سامان ضیافت بھی کیا، کھانے سے فارغ ہونے کے بعد آپ ؐ نے کچھ ارشاد فرمانا چاہا تو ابولہب نے بات کاٹ دی اور لوگوں سے مخاطب ہو کر کہا "یہ تم لوگوں پر پہلے ہی سے جادو چلا رہے تھے"۔ یہ سننا تھا کہ مجمع منتشر ہو گیا اور آپ کو کچھ کہنے کا موقع نہ ملا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے خاندان کے لوگوں سے مایوس ہو کر موسم حج میں عام قبائل عرب کے سامنے اپنی دعوت پیش کی، اس وقت بھی ابولہب پیچھے پیچھے ہو کر یہ اعلان کرتا جاتا تھا "یہ شخص تم کو لات وعزیٰ سے برگشتہ کر کے اپنی لائی ہوئی بدعت وضلالت کی دعوت دیتا ہے، تم اس کی بات ہرگز نہ سنو اور نہ مانو!"

۴۔ مولانا نے ابولہب کی خصوصیت ذکر کی یہ خاص مصلحت بتائی ہے کہ اس کے تذکرہ میں دشمنانِ خدا سے برات اور سب سے کٹ کر خدائے واحد سے رشتہ جوڑنے کا مضمون پنہاں ہے، اس پہلو سے یہ سورہ بعد میں آنے والی سورۂ اخلاص وتوحید کی تمہید ہے، غور کیجئے کہ جب خدا نے آپ کے تمام مخالفین کو چھوڑ کر آپ ؐ کے چچا کا ذکر کیا تو اس کی وہی حیثیت ہوئی جو آزر کی ہے، اور اس کا مقصد یہ

تعلیم دینا ہے کہ جن کے اعمال خدا سے دور کرنے والے ہوں گے وہ نیکوں کے رشتہ وقرابت سے کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکتے، یہاں تک کہ اس نبیؐ کا رشتہ بھی کچھ سود مند نہیں ہو سکتا۔ اس موقع پر مولانا نے سورۂ ممتحنہ اور برارت کی آیتیں نقل کر کے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ اتمام حجت کا فرض پورے طور پر ادا کرنے کے بعد جس طرح حضرت ابراہیمؑ اپنے باپ سے کنارہ کش ہو گئے تھے، اسی طرح اتمام دعوت اور لزوم ہجرت کے بعد پیغمبر عالمؐ نے اپنے چچا کے خلاف اعلان حق کر دیا جو ابولہب کے لیے نہایت کاری زخم تھا کیونکہ یہ اعلان اس ذات اقدسؐ کی طرف سے تھا جو دنیا کے لیے عموماً اور اپنے رشتہ داروں کے لیے خصوصاً سراپا مہر ومحبت تھی اور جو ان کی مغفرت کے لیے اس وقت تک مشغول دعا رہی جب تک خدا نے اس کی ممانعت نہیں فرمادی۔

مولانا فرماتے ہیں کہ اس پہلو سے یہ سورہ ہمارے لیے خدا کی گرفت کی ایک نہایت عبرت انگیز مثال ہے کہ اگر پیغمبر عالمؐ کا چچا بھی نافرمانی اور سرکشی کرے تو خدائے قہار کی پکڑ سے محفوظ نہیں رہ سکتا، اس سے ہم کو یہ تعلیم دینا مقصود ہے کہ تمام امر وحکم خدا کے لیے ہے، وہ عدل وحق قائم کرنے والا ہے، اس کی عدالت خاندان ونسب اور عزت وجاہ کے اثر وزور سے بالا ہے، اس لیے تمام سہارے جھوٹے اور تمام وسیلے باطل ہیں، اسی کی ذات پناہ اور سہارا ہے، پس اسی کو راضی کرنا وسیلۂ نجات ہے کیونکہ کوئی سفارش بغیر اس کے اذن کے نہیں ہو سکتی، وہ بے نیاز اور بے ہمتا ہے، باطل پرستوں کو گمان تھا کہ خدا کے بیٹے بیٹیاں ہیں جو اس کے بندوں کی شفاعت کریں گے، خدا نے ابولہب کا انجام بیان فرما کر ان تمام باطل امیدوں کا خاتمہ کر دیا۔

ابولہب کی طرح اس کی بیوی کا بھی اس سورہ میں ذکر ہے، قرآن کتاب حکیم ہے اس لیے انسان کی اصلی طلب وجستجو یہ ہونی چاہئے کہ اس میں حکمت تلاش کرے، مولانا فرماتے ہیں کہ خدا نے قرآن مجید میں بعض قوموں اور افراد کا ذکر خیر وشر کی مثال کی حیثیت سے کیا ہے تاکہ ان کو خدا کی جو نعمت ونقمت پہنچی ہے، ہم اس سے عبرت حاصل کریں، اس سلسلہ میں جس طرح بعض مردوں کا ذکر ہے اسی طرح بعض عورتوں کا بھی ذکر ہے، اس کی وجہیں مولانا فراہیؒ یہ بیان کرتے ہیں: ۔

۱۔ ہم جنس ہم جنس کے واقعات وحالات سے عبرت حاصل کرتا ہے۔

۲۔ بعض اخلاقی معائب ومحاسن مردوں کے ساتھ مخصوص ہیں اور بعض عورتوں کی خصوصیات

ہیں، پس تبلیغ و دعوت کے نقطۂ نظر سے ضروری ہوا کہ دونوں صنفوں کا تذکرہ کیا جائے۔

۴۔ جو لوگ قوموں کی تاریخ پر غور کرتے ہیں وہ جب اہم واقعات کے اسباب و علل کا سراغ لگاتے ہیں تو بسا اوقات ان کا آخری سرا کسی پردہ نشین کی نازک انگلیوں میں پاتے ہیں اس لیے اگر قرآن ان کا ذکر نہ کرتا تو دقائق حکمت کا ایک عظیم الشان باب ہماری نگاہوں سے مخفی رہ جاتا۔

عورتوں کی بعض بری عادتوں کے برے اثرات ان کے شوہروں تک متعدی ہوجاتے ہیں مثلاً عورتوں میں بخل اور زینت و آرائش کا شوق غیر معمولی ہوتا ہے، یہ چیز ان کے شوہروں کو آمادہ کرتی ہے کہ جس ذریعہ سے ممکن ہو، ان کے لیے دولت حاصل کریں اور اس دولت کو ادائے حقوق اور اعانت مستحقین کی جگہ ان کے جسموں پر لاد دیں، یہی وجہ ہے کہ اللہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات کو دنیا کی زینت سے نفرت دلائی اور اس کے معائب جس تفصیل سے بیان کیے کسی اور چیز کو اس تفصیل سے نہیں بیان کیا، یہاں تک کہ اس کو جاہلیت کی یادگار اور نجاست سے تعبیر کیا۔

۵۔ عورتوں کی زر پرستی کی علت صرف زینت و آرائش کا شوق ہی نہیں ہے بلکہ بخل ان کی فطرت کا ایک مستقل عنصر ہے، اسی وجہ سے وہ عموماً اپنے شوہروں کو فیاضی اور سخاوت سے روکتی ہیں، عربی شعرا فیاضی پر عورتوں کی ملامت کا بہت تذکرہ کرتے ہیں، قرآن مجید نے بھی متعدد جگہ اس راز کو آشکارا کیا ہے اور مردوں کو متنبہ کیا ہے کہ جب وہ اللہ کی راہ میں خرچ سے روکیں تو ان کی بات پر کان نہ دھریں، لیکن ساتھ ہی ساتھ ان کے معاملہ میں عفو و درگذر سے کام لینے کی بھی ہدایت کی ہے، جو لکڑی سیدھی نہیں ہو سکتی ضروری نہیں کہ توڑ دی جائے۔

۶۔ ابولہب کی دولت اچھی راہ سے نہیں آئی تھی، اس کی زر پرستی اور طمع مال نے اس کو بدترین معاصی کا مرتکب بنایا، اس نے اللہ سے خیانت کی، رشتہ رحم کو توڑا، پیغمبر سے دشمنی کی اور اسی عداوت کی آگ میں جل کر مر گیا، اللہ نے اس کے عذاب میں اس کی بیوی کو اسی لیے شریک کیا کہ اس عذاب کے اسباب پیدا کرنے میں وہ بھی برابر کی شریک تھی، اس نے اپنے شوہر کو مجبور کیا کہ وہ حرام و حلال جس راہ سے ممکن ہو اس کی زینت و آرائش کا سامان فراہم کرے تاکہ ہم چشموں میں اس کی گردن بلند ہو اس کے لیے وہ ادائے حقوق سے مانع ہوئی اور اسے معاصی پر آمادہ کیا۔

ان وجہوں سے اللہ نے جس طرح ابولہب کو مردوں کے لیے نمونہ عبرت قرار دیا، اسی طرح اس کی بیوی کو عورتوں کے لیے مثال ٹھہرایا کہ عالم انسانی کے دونوں طبقے بخل اور شوق زینت کے برے نتائج سے آگاہ ہو جائیں اور لوگ اپنی بیویوں سے خبردار رہیں کہ وہ ادائے حقوق اور انفاق فی سبیل اللہ سے روک کر ان کے لیے کس قدر خوفناک فتنہ بن سکتی ہیں، اس سے ہم کو یہ سبق ملتا ہے کہ بخل کوئی معمولی برائی نہیں ہے بلکہ یہ بے شمار برائیوں کا سرچشمہ ہے، قرآن پاک میں ہے:

وَمَنْ يُوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ (حشر: ۹)	جو بخل سے محفوظ رہے، انہی نے فلاح پائی۔

۶۔ اس سورہ میں تکلیف مالایطاق کا ذکر نہیں

مولانا نے آخر میں اس سورہ سے تکلیف مالایطاق کے وقوع پر کیے جانے والے استدلال کا رد کیا ہے، یہ خیال اشاعرہ کا ہے مگر اس میں حنفیہ اور بعض اکابر شافعیہ مثلاً امام ابو محمد اسفرائنیؒ اور امام غزالیؒ ان کے ساتھ نہیں ہیں اور دراصل اشاعرہ نے معتزلہ کے جواب میں اس کو اختیار کیا ہے کیونکہ معتزلہ یہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ پر عدل واجب ہے مگر اہل سنت کے اکثر فرقے یہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ حاکم مطلق ہے جو چاہتا ہے کرتا ہے اور جو پسند کرتا ہے حکم دیتا ہے، وہ سب کا خالق ہے اور تمام جہان مخلوق ہے، مخلوق خالق پر کوئی چیز کیونکہ واجب کر سکتی ہے، اس سورہ سے امام ابوالحسن اشعریؒ نے کتاب الابانہ میں تکلیف مالایطاق کے وقوع پر اس طرح استدلال کیا ہے۔

"معتزلہ سے کہا جائے گا کہ کیا اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا کہ تبت یدا ابی لہب وتب ما اغنی عنہ مالہ وما کسب، سیصلیٰ ناراً ذات لہب اور اس کے باوجود ابولہب کو ایمان لانے کا حکم دیا اس طرح اس کے اوپر واجب کیا کہ وہ یہ جانے کہ وہ ایمان نہیں لائے گا اور اللہ تعالیٰ اس کے متعلق اس خبر میں صادق ہے اس کے باوجود حکم دیا کہ وہ ایمان لائے اور ایمان اور یہ علم کہ یہ نہیں ہوگا دونوں جمع نہیں ہو سکتے، صاحب قدرت اس بات پر قدرت نہیں رکھتا کہ وہ ایمان لائے اور یہ بھی جانے وہ ایمان نہیں لائے گا لیکن جب یہ بات اسی طرح ہے تو اللہ نے ابولہب کو ایسی بات کا حکم دیا جس پر وہ قادر نہیں تھا کیونکہ اس نے اس کو حکم دیا کہ وہ ایمان لائے اور وہ جانتا تھا کہ وہ ایمان

نہیں لائے گا"[۸]

مولانا اس استدلال کا تجزیہ کرکے بتاتے ہیں کہ یہ دو مفروضوں پر مبنی ہے (۱) اس سورہ کا مخاطب ابولہب ہے اور اس کو اس بات کا یقین کرنے کا حکم دیا گیا ہے کہ وہ ایمان نہیں لائے گا۔ (۲) یہ سورہ ابولہب پر اتمام حجت اور آنحضرتؐ کے اعراض سے پہلے نازل ہوئی، اوپر مولانا ان دونوں مفروضوں کی مفصل تردید فرما چکے ہیں۔

امام رازیؒ نے اس دلیل کو جمع بین النقیضین کے قالب میں ڈھال کر نئے آب و رنگ سے پیش کیا ہے مولانا ان کی بحث و استدلال کی تفصیل تحریر کرکے ان کی بھی تردید کرتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ جو لوگ تکلیف ما لایطاق کے مدعی ہیں ان کے مفید مطلب اس سورہ میں کوئی دلیل نہیں ہے، یہ نزاع محض لفظی ہے، امام اشعریؒ کا رتبہ اس سے ارفع ہے کہ ان کی طرف ایک ایسا عقیدہ منسوب کیا جائے جس سے ذاتِ باری کی طرف ظلم کی نسبت ہوتی ہے۔

مراجع و حواشی

۱ ابوالکلام آزاد، ترجمان القرآن، ساہتیہ اکادمی، نئی دلی، جلد اول ص۳۱

۲ ایضاً ص۴۲-۴۴ ۳ ایضاً ص۳۱

۴ مطبوعہ دائرہ حمیدیہ، مدرسۃ الاصلاح، سرائے میر (اعظم گڑھ) ۱۳۶۰ھ

۵ مطبوعہ دائرہ حمیدیہ، ۱۹۷۵ء

۶ اصل عربی متن اور مولانا امین احسن اصلاحی کا اردو ترجمہ دونوں دائرہ حمیدیہ سے شائع ہو چکے ہیں۔

۷ جمہرۃ خطب العرب (مرتبہ احمد زکی صفوت) مصر، ۱۹۳۳ء، ص۵۲ خطبہ کی یہ عبارت بعض الفاظ کے اختلاف کے ساتھ حدیث میں بھی ملتی ہے۔ ملاحظہ کیجئے صحیح البخاری، کتاب المناسک، باب مایقول اذا رجع من الحج او العمرۃ او الغزو۔

۸ تفسیر سورہ لہب، ترجمہ مولانا امین احسن اصلاحی، طبع دوم ص۷